

مسلم اور غیر مسلم فلاسفس کی نظر میں نظریہ خیر و شر

THE CONCEPT OF GOOD AND EVIL IN VIEW OF MUSLIM AND NON-MUSLIM PHILOSOPHERS

*مصور سکندر مکول

**شبانہ ماچھی

ABSTRACT

The concept of 'Good and evil' has remained solvable notion since inception of human intellect. The every individual uses terms i.e. good and evil, deeds and misdeeds and virtue and vice etc. in daily life. Firstly, philosophy of west is based on wisdom and fabric of society. Secondly, as for as Muslim philosophers are concerned they view good as a virtue for human being in all times especially past and present. The evil is termed to prove as the curse respectively.

According to the Muslim philosophers sometimes wisdom may deceive human being but divine perception neither deceives nor utters any argument which is contrary to wisdom. Therefore, Muslim philosophers view the Islamic Law as the pivotal source along with the perception of wisdom to know good and evil.

Islam advocates the comforts, ease and peace for humanity as a whole rather than only individual. It has always kept wisdom dependent upon revelation because all the times wisdom may not access to the reality.

Keywords: Good and Evil, Literature, Muslim and Non-Muslim Philosophers, Religion.

غیر مسلم فلاسفہ کے نزدیک خیر و شر

سقراط کا نظریہ خیر و شر:

سقراط کے نزدیک نظریہ خیر و شر کا مرکزی خیال اس نظریہ پر مبنی ہے کہ علم خیر ہے اور شر کی بنیاد جہالت ہے۔ اس سے سوفسطائیوں نے حسی ادراک اور علم کو مترادف خیال کیا تھا جس کے نتیجے میں یہ نظریہ حد درجے کی اضافیت کا شکار ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں، آدمی ہر شے کا پیمانہ

* اسسٹنٹ پروفیسر، قائد عوام یونیورسٹی آف انجینئرنگ، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، لاڑکانہ کیمپس۔

** پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اسلامک کلچر، جامعہ سندھ جام شورو۔

ہے۔ پروٹاگورس کے اس مقولہ کی بنیاد پر ہر شخص اپنے اخلاقی فعل کا ذاتی معیار قائم کر بیٹھا تھا جس کو کوئی بھی مبارزت نہیں کر سکتا تھا نتیجے میں معاشرہ اخلاقی لحاظ سے بری طرح انحطاط کا شکار تھا

اس صورتحال میں سقراط نے علم کی بنیادوں کو عقلی لحاظ سے یعنی استقرائی استدلال کی بدولت تعلقات یا تصورات کلیہ پر استوار کیا۔ جس سے اخلاقی مسائل کا ایسا مشترکہ سرمایہ ہاتھ آیا جو اخلاقیات یعنی خیر و شر کی معرفیت کی سند بنا۔ سقراط نے علم کو خیر اور خیر کو علم قرار دیا کیونکہ علم اخلاق اعمال کی بنیاد ہے۔ جب تک کسی شخص کو نیکی کے متعلق یا تعریف سے آگاہی نہ ہو وہ نیک کام نہیں کر سکتا۔ سقراط کے نزدیک نیکی کے تعلق سے آگاہی کے بغیر جہاں نیک کام نہیں کیا جاسکتا وہاں نیکی کے تعلق سے آگاہی کے بعد بر اکام ہو ہی نہیں سکتا۔^۱

گویا نیکی کے مفہوم کو جان لینا، نیک کام کرنے کے مترادف ہے۔ بالفرض کوئی شخص نیکی کے مفہوم کو جاننے کے بغیر نیک کام کرتا ہے تو وہ اس شخص سے بہتر ہے جو نیکی کے مفہوم کو جاننے کے باوجود کوئی بر اکام کرتا ہے۔ مجموعی طور پر سقراط کا اصرار ہے کہ خیر کا علم رکھنے کے بعد دیدہ دانستہ کوئی شخص بھی بر اکام نہیں کر سکتا۔ ارسطو سقراط کے اس نقطہ نظر پر تنقید کرتا ہے کہ وہ انسانی روح کے غیر عقلی حصوں کو نظر انداز کر گیا ہے ارسطو کے خیال میں انسان کے اخلاقی فعل کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ علم ۲۔ ارادہ

بعض اوقات انسان نیکی و بدی کا واضح علم رکھتا ہے مگر نیکی کا مفہوم جاننے کے باوجود برائی کا ارادہ کر لیتا ہے۔ اس صورتحال کی شعری تصویر کشی غالب کے اس شعر میں ملتی ہے۔

جاننا ہوں ثواب طاعت وزہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

داستان دانش کے مصنف خلیفہ عبدالحکیم^۲ نے ارسطو کے ناقدانہ موقف کا تجزیہ کرتے ہوئے سقراط کے اخلاقی نقطہ نظر کو واضح کیا ہے۔ ان کے خیال میں علم کی قسمیں اور یقین کے مدارج متعین کئے جائیں تو وہ تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔

۱۔ علم الیقین:- یہ علم کا وہ درجہ ہے جس میں کسی سے کچھ سنا جائے۔

۲۔ عین الیقین:- یہ علم کا وہ درجہ ہے جس میں خود دیکھا جائے۔

۳۔ حق الیقین:- یہ علم کا وہ درجہ ہے جس میں خود کو تجربہ ہو۔

خلیفہ عبدالحکیم کے خیال میں سقراط علم سے مراد حق الیقین لیتا ہے جہاں کوئی شخص جاننے کے بعد اس کے خلاف عمل کر ہی نہیں سکتا اس درجے پر انسان کا علم اور ارادہ جدا نہیں رہتے۔ بہر حال سقراط کا یقین ہے کہ ہر شخص عدالت و سعادت کا خواہشمند ہے جو اخلاقی اقدار میں سے بہترین خیر ہے۔ جو شخص ان تصورات کا علم رکھتا ہو وہ ان کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ سقراط کے خیال میں کوئی شخص دیدہ دانستہ بر اکام نہیں کر سکتا۔

بالفرض اس سے برا کام سرزد ہو جائے تو اس کی وجہ اس کی جہالت اور لاعلمی ہوگی۔ جس طرح لذتہ کا یہ موقف ہے کہ کوئی شخص دیدہ دانستہ حصول اذیت والا راستہ اختیار نہیں کرتا اسی طرح سقراط کا یقین ہے کہ کوئی شخص دیدہ دانستہ برا کام نہیں کر سکتا۔ لذتہ اور سقراط دونوں کے نزدیک برائی کا عمل علم میں کمی یا نقص کے سبب ہو سکتا ہے، بطور محاصل یہ کہا جاسکتا ہے کہ خیر کی بنیاد علم ہے اور شر کی بنیاد جہالت۔^۲

علم چونکہ صداقت اور حقیقت کا مربوط اور ہم آہنگ نظام و جدت ہے اس لیے نیکی بھی ایک ہے تمام دیگر نیکیاں جیسے شجاعت، تصرف نفس اور اعتدال وغیرہ اسی فضیلت واحدہ کی شاخیں ہیں۔ نیکی اس لیے کی جاتی ہے کہ نیکی کرنا بذات خود مقصود ہوتا ہے۔ یعنی نیکی برائے مقصد کے بجائے نیکی برائے نیکی اخلاقیات کا ہدف ہے۔ نیکی میں انسان کا نہ صرف ذاتی مفاد ہوتا ہے بلکہ نیکی حقیقتاً حقیقی مسرت اور اطمینان قلب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ نیکی اور مسرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے سقراط کا پیغام یہی ہے کہ روح کی نگہداشت کرنا فرض اولین ہے۔ مزید برآں سقراط حیات بعد الموت کا قائل ہے۔ اس لئے وہ خیال کرتا ہے کہ نیکی کی بدولت انسان کی روح جب مادی آلائشوں کی آلودگی سے پاک ہو جاتی ہے تو انسان کو روحانی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے جسکی بدولت اخروی دنیا کی کامیابی کی امید بن پاتی ہے۔ سقراط کا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان علم کی بنا پر خیر کی طرف مائل ہوتا ہے جب کہ جہالت کی بدولت شر کی طرف مائل ہوتا ہے اور سقراط یہ کہتا ہے کہ انسان کو پہلے علم حاصل کرنا چاہئے کیونکہ خیر کی طرف جانے کے لئے علم بہت ضروری ہے۔^۳

افلاطون کا نظریہ خیر و شر

مسئلہ خیر و شر کا حل افلاطون نے اپنی مابعد الطبیعات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی۔ ذریعہ تو وہ معاشرہ ہے جس میں انسان پر دان چڑھتا ہے معاشرہ میں انسان کی ہوش و آگاہی سے قبل ہی نیک و بد اور خیر و شر کے کچھ معیار موجود ہوتے ہیں جو انسان کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اخلاقی فعل کی قدر و قیمت متعین کرنے کا دوسرا ذریعہ خود انسان کی عقل ہے۔ کسی فعل کی خود انسان جب عقلی طور پر جانچ پرکھ کرتا ہے تو وہ اس فعل کے خیر یا شر ہونے کے متعلق خود فیصلہ کرتا ہے۔^۴

افلاطون کے نزدیک خیر و شر سے آگاہی کا پہلا ذریعہ معاشرہ کسی حد تک تو جائز ہے لیکن وہ ایک مستقل بنیاد نہیں بن سکتا۔ مستقل بنیاد افلاطون کے نزدیک صرف عقل ہی ہے۔^۱ چنانچہ اخلاقی اقدار کا ماخذ نہ تو انسان کی حسی کیفیات ہیں اور نہ ہی رسوم و رواج اخلاقی اقدار کا سرچشمہ خود عقل انسانی ہے یعنی انسانی شخصیت کا وہ پہلو جس کا تعلق ایک طرف دنیائے حقیقت سے ہے اور دوسری طرف مادی دنیا سے ہے۔ افلاطون نے چار فضائل کا ذکر کیا ہے۔ یہ چاروں فضائل انسانی شخصیت کے مختلف مدارج کے متعلق ہیں۔

۱. سب سے پہلے وہ عقل کے طور پر کام کرنے کا ذکر کرتا ہے عقلجب صحیح طور پر کام کرتی ہے تو یہ دانائی (Wisdom) بن جاتی ہے۔

۲. دوسری فضیلت شجاعت (Courage) ہے جذبات و احساسات جب تک عقل کے تابع ہو جاتے ہیں تو انسان کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ کون سی شے سے ڈرنا چاہیے اور کون سی شے نہیں ڈرنا چاہئے۔

۳. تیسری فضیلت ضبط نفس (Self Control) ہے ضبط نفس سے افلاطون کی مراد انسانی شخصیت کی ایسی تنظیم ہے کہ جس میں عقل یا روح حاکم ہو اور جسم یا جبلت محکوم ہو۔

۴. چوتھی فضیلت عدل (Justice) ہے عدل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسانی شخصیت کے تمام مدارج میں توافق کے مطابق اور نظم و ضبط پیدا ہو جائے۔^۷

افلاطون کے قول کے مطابق جب عقل، جذبہ اور شہوت میں توازن پیدا ہو جائے تو زندگی میں سعادت اور نیکی پیدا ہو سکتی ہے۔ تاہم بعض مقامات پر افلاطون نے علم اور بصیرت کو نیکی یعنی خیر کا منبع قرار دیا ہے۔ سقراط و افلاطون کہتے ہیں کہ کوئی شخص جان بوجھ کر غلط عمل نہیں کر سکتا ہر غلط کار جو کچھ کرتا ہے اس کو اس وقت صحیح سمجھ کر ہی کرتا ہے۔ اگر وہ اس کو اچھا اور صحیح نہ سمجھے تو اسے کبھی نہ کرے۔ افلاطون کی علم سے مراد حقائق کے حق الیقین سے ہے۔

عام طور پر خیر و شر کا علم قال اور استدلال سے آگے نہیں بڑھتا اور عقل تاویل مشروب جذبات کی غلامی میں حسب موقع جواز کا وجود تلاش کر لیتی ہے۔ فطرت کی خرابی سے یا خراب عادتوں کے باعث انسان کی عادتیں بھی خاص قسم کے اعمال کی عادی ہو کر خالی علم کے مقابلے میں مجبور اور مفلوج ہو جاتی ہیں۔ انسان اسی علم کو آسان سمجھتا ہے اور آسانی سے کرتا ہے جسے وہ بار بار کر چکا ہو اس لیے خالی علم پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ خراب عمل کی عادت بوقت عمل صحیح علم کو ہی مسح کر دے گی اور مسخ شدہ علم سے انسان سے شر ہی سرزد ہو گا۔^۸

سوفسطائیوں کے نظریہ خیر و شر پر افلاطون کا اعتراض اعتراض نمبر ۱۔

سوفسطائیوں کے نزدیک ایک ہی فعل ایک لمحے کے لئے کسی فرد کو خیر محسوس ہوتا ہے تو وہ خیر ہے اور دوسرے لمحے اسے شر محسوس ہوتا ہے تو وہ شر ہے۔^۹ اسی طرح کی اخلاقی تعلیمات کا پنچہ تو قطعی اخلاقی اضافیت (Absolute Moral Relativity) میں نکلتا ہے جہاں معاشرے کے لئے کوئی مشترکہ اخلاقی معیار قائم نہیں کیا جاسکتا۔

اعتراض نمبر ۲:

سوفسطائیوں کے نزدیک ہر فرد کو جو اخلاقی فعل لذت بخشنے وہ خیر ہے۔ اور جو اخلاقی فعل تکلیف کا باعث ہو وہ شر ہے۔ ایک فرد کو فعل لذت دیتا ہے اسی وقت وہ کسی دوسرے فرد کے لئے اذیت کا باعث ہو سکتا ہے یوں ایک کے لئے تو وہ خیر اور دوسرے کے لئے شر ہو گا۔ اس طرح اخلاقی تعلیمات کا نتیجہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر خیر اور شر کی تمیز ہی جاتی رہے گی اگر ہر فرد اپنی جگہ پر درست ہو تو اخلاقی فعل کی قدر کا تعین کیوں کر ہو سکے گا۔

اعتراض نمبر ۳:

سوفسطائیوں کے نزدیک اخلاق کا دار و مدار احساسات پر ہے ہر فرد کے احساسات مختلف ہیں جن میں کوئی قدر مشترک نہیں نتیجتاً کوئی مسلمہ اخلاقی قانون یا ضابطہ اخلاق مرتب نہیں کیا جاسکتا جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔ یہ صرف اور صرف عقل کا خاصہ ہے جسکی بنیاد پر کوئی قانون یا ضابطہ اخلاق مرتب کیا جاسکتا ہے۔^{۱۰}

سوفسطائیوں کے نزدیک کسی بھی فعل کے خیر شر ہونے کا اندازہ مسرت و لذت سے ہوتا ہے اس طرح کا تصور محض لذت یا مسرت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ فعل فی نفسہ خیر ہوتا ہے۔ اس کے مقصود اور کچھ حاصل کرنا نہیں ہوتا۔

ارسطو کا نظریہ خیر و شر

ارسطو کے نزدیک زندگی کا مقصد مسرت یا لذت کا حصول ہے لیکن اس کے تصور میں اور حکمائے مغرب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ارسطو اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ زندگی کا مقصد خیر اس لئے نہیں کہ خیر بنفسہ اچھی چیز ہے بلکہ حصول مسرت کے لیے ہیں۔ ارسطو کا نظریہ یہ ہے کہ ”کسی فعل سے لذت اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ خیر ہوتا ہے۔“ لذت اخلاقی فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے یہ بذات خود اخلاقی قدروں کی بنیاد یا معیار نہیں بن سکتی۔ جدید مفکرین بھی ارسطو کی پیروی میں یہ سوچتے ہیں کہ پہلے خیر کی تعریف کرنی چاہیے اور اس کے بعد یہ کہنا چاہئے کہ ہمارے اعمال ایسے ہونے چاہیں جن سے اس خیر کا حصول ہو سکے۔ یہ ارسطو ہی کی پیروی ہے جو یہ کہتا ہے کہ مسرت ہی خیر ہے یعنی اگر انسان کو اپنے اعمال سے مسرت و لذت نہ ملے تو وہ شر ہونگے۔

ارسطو کا نظریہ خیر و سطرزیر کی صورت میں

ارسطو کا کہنا ہے کہ بعض اوقات انسان کو علم تو حاصل ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود جذبات و خواہشات کی شدت سے مغلوب ہو کر ایسے فعل کا مرتکب ہو جاتا ہے جسکی عقل اجازت نہیں دیتی اگر عقل اور علم کے باوجود انسان گمراہی کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ تو وہ ان اصولوں پر معاشرہ بھی تشکیل دے سکتا ہے۔ ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کس طرح خیر کا راستہ اپنا سکتا ہے۔ ارسطو کا جواب یہ ہے کہ مسلسل مشق اور اعادہ سے بہتر اخلاق زندگی پیدا کی جاسکتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ چاہے انفرادی طور پر لیکن اس کوشش میں مصروف رہے کہ جذبات و خواہشات پر عقل کی حکمرانی قائم کی جائے۔ مسلسل مشق سے سرکش جذبات کو عقل کے تابع فرمان کیا جاسکتا ہے اس طرح حیوانی تقاضوں کو عقلی تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی عادت بن جاتی ہے۔“

ارسطو کے نزدیک نہ ہی ایک ایسی راہبانہ طرز زندگی جائز ہے جس میں حیوانی تقاضوں کی مکمل نفی کر دی جائے اور نہ ہی ایک ایسی زندگی قابل تحسین ہے جس میں حیوانی جذبات کا محاسبہ کرنے سے عقل مفلوج ہو کر رہ جائے۔ نیکی اور فضیلت روح کے معقول اور غیر معقول حصوں میں توازن اور اعتدال کا نام ہے۔ افلاطون نے بھی یہی کہا تھا کہ جب عقل، جذبہ اور شہوت میں توازن پیدا ہو جائے تو زندگی میں سعادت اور نیکی پیدا

ہو سکتی ہے۔ اس سطور نے اس نظریہ اعتدال کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر نیکی دو بدیوں کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ ہر معاملہ میں افراط بھی ہوتی ہے اور تفریط بھی۔ اس وسط زریں کا تعین کسی لگے بندھے قاعدے، کلیہ سے نہیں ہوتا۔ ہر شخص کے لیے وسط زریں مختلف حالتوں میں مختلف جگہوں پر واقع ہو گا اور اسے حاصل کرنے کے لیے نیکی کی عادت کو سیرت کا جزو بنانا ہوتا ہے جو علم کی فراوانی سے نہیں بلکہ جذبات کے مسلسل تصرف اور ضبط نفس کی مشق سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنے نظریہ اعتدال کی تشریح و توضیح کے لیے اس سطور نے مثالیں دے کر وسط زریں کی وضاحت کر کے خیر کی وضاحت کی ہے جسے وہ توازن کا نام بھی دیتا ہے۔

افراط	وسط (خیر)	تفریط
تہور	شجاعت	بزدلی
شہوت پرستی	عصمت	بے حسی
اسراف	سخاوت	بخل
غرور	خودداری	عجز
شر میل اپن	حیا	بے شرمی
بے صبر اپن	صبر و تحمل	نا سمجھی
حقارت	عزت و احترام	کبر و نخوت
بے اعتنائی	شرافت نفس	تنگ مزاجی
اکھڑپن و ناشائستگی	لطف و عنایت و یگانگت	خوشامد اور چاپلوسی
گنوار پن	بذلہ سنجی	ابلہ پن
قدامت پسندی	روشن خیالی	آزاد خیال

البتہ اس سطور کے جاں اس وسط میں شمار کرنے کے لیے کسی معیاری ضابطے کو سامنے نہیں لایا گیا۔ قدیم یونانی حکماء جمال اور خیر میں کوئی تمیز نہ کرتے تھے وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ خود جمال پرست تھے اور ہر شے میں تناسب اور حسن دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی اصول کی بنا پر اس سطور نے وسط زریں کا تصور دیا۔ وہ خیر کو بھی حسن بمعنی توازن ہی کی خصوصیت کے طور پر سامنے لایا ہے۔ عملی دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ ہر خیر کا حامل فعل حسین ہونے کی خود بخود صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض خیر کے حامل افعال حسین کہے جاسکتے ہیں لیکن ہر ایسے عمل کے لئے ضروری نہیں کہ حسین بھی ہو۔^{۱۲}

اس بحث کا خاتمہ ارسطو کے اس نظریہ سے ہوتا ہے کہ مسرت عمل خیر سے عبارت ہے اور مسرت کامل مضمر ہے۔ کسی بھی عملی کام پر تفکر قابل ترجیح ہے کیونکہ اس سے آسودگی ملتی ہے اور آسودگی مسرت کے لیے ضروری ہے عملی فضیلت محض ثانوی نوعیت کی مسرت دیتی ہے۔ اعلیٰ ترین مسرت عقلی عمل میں ہے کیونکہ ہر کسی اور چیز کے علاوہ عقل و فکر ہی انسان ہے۔ (Reason in man) انسان کلی تفکر نہیں ہو سکتا لیکن جس حد تک وہ کرتا ہے وہ حیات الوہی میں شریک ہو جاتا ہے۔

حصول مسرت میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا حل اس بات پر منحصر ہے کہ انسان اور دیگر جانداروں میں کیا فرق ہے۔ یعنی عقل کی بنا پر انسانوں کو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اسی کے ذریعے تسخیرہ کائنات کرتا ہے۔ اس استعداد کی نشوونما انسان کو اقتدار بخشتا ہے تو معلوم ہوا کہ مسرت کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ انسان عاقلانہ زندگی بسر کرے۔ لہذا انسان کی حقیقی مسرت عقلی استدلال کے ذریعے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حیوانی جبلتوں کو انسانی اخلاق سے خارج کرنے کے لیے عقلی و منطقی استدلال سے قابو پایا جائے۔ یہی خیر و شر کا پیمانہ ہے جو ارسطو کی زبان میں Insight بصیرت یا گہری بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔

مسلم فلاسفہ کے نزدیک خیر و شر

امام غزالی کا نظریہ خیر و شر

جس کام کا کرنا ضروری ہو یا جس کا کرنا زیبا و لائق ستائش ہو وہ خیر اور جس کام سے مجتنب رہنا ضروری ہو یا جس کا ارتکاب نازیبا اور ناشائستہ ہو وہ شر ہے۔^{۱۳}

امام غزالی کے ہاں خیر کی حالتیں

امام غزالی کا کہنا ہے کہ وہ چیز جسے لوگ خیر کہا کرتے ہیں، وہ تین حالتوں سے باہر نہیں ہو سکتی

- ۱۔ یا تو وہ زمانہ حال میں راس ہوگی
- ۲۔ یا مستقبل کے لئے فائدہ مند ہوگی یا
- ۳۔ فی نفسہ اچھی ہوگی (یعنی ہر زمانے کے لئے مفید ہی ہوگی)

شر کی تین حالتیں

امام غزالی شر کی بھی تین حالتیں بیان کرتے ہیں۔

- ۱۔ یا تو زمانہ حال کے لیے ناسازگار رہے گی۔

۲۔ یا مستقبل میں نقصان کا باعث ہوگی۔

۳۔ فی ذاتہ بری ہوگی (یعنی ہر زمانے میں اس سے نقصان ہی نقصان ہوگا) ۱۴

پس خیر تمام یعنی خیر کامل وہی ہے جس میں یہ تینوں صفات موجود ہوں یعنی حال بھی خوش آئے، مستقبل میں بھی سازگار ہو اور ہر زمانے میں سودمند رہے۔ یہ بات صرف علم و حکمت کو حاصل ہے کہ اس کے سوا یہ تینوں صفات کسی بھی چیز میں یکجا نہیں ہیں۔ اسی طرح شر تمام یعنی مکمل شر وہ ہے کہ ناسازگار بھی ہو نقصان دہ بھی ہو اور ہر زمانے میں بد ہو۔ امام غزالی کا کہنا ہے کہ کوئی عمل فی نفسہ اچھا یا برا نہیں ہے بلکہ اچھا وہ ہے جسے شرع نے اچھا کہا ہو۔ برا وہ ہے جسے شرع نے برا کہا ہو۔ امام غزالی کی یہ رائے معجزہ کے نظریہ پر ایک کاری ضرب ہے کیونکہ معجزہ کہتے ہیں کہ "بعض اعمال ایسے ہیں جن کے حسن کو ہم شرع کا سہارا لیے بغیر بھی عقل کے توسط سے معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ ڈوبتے ہوئے کو بچانا یا کسی مصیبت میں گرفتار کو نجات دلانا اچھا عمل ہے، سچ بولنا فی نفسہ اچھا اور حسن ہے بعض اعمال ایسے ہیں جن کی برائی کو ہم مذہب کی شمع ہاتھ میں لیے بغیر بھی ڈھونڈ سکتے ہیں مثلاً احسان فراموشی، بے گناہ کو ضرر پہنچانا، بے وجہ جھوٹ کے ساتھ زبان کو آلودہ کرنا وغیرہ۔" ۱۵

امام غزالی جو اب دیتے ہیں۔

"مبیینہ خوبیاں یقیناً لوگوں میں بہت شہرت رکھتی ہیں اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مذہب کی تحریص یا ذاتی غرض و منفعت کا مطلقاً دخل نہیں لیکن ان کا دقیق تجزیہ کرنے سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ ان کے پیچھے بھی کہیں نہ کہیں مذہب یا کسی ذاتی غرض کے تصور کا ہاتھ برابر کام کرتا ہے۔" ۱۶

حق سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے انسان کے قلب پر جو الہام ہو اور اس کو قبول کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اس الہام کی تعمیل میں آپ کو محو عمل کر دے، وہ خیر ہے۔ ہر ایک وہ عمل جس پر دنیا و آخرت میں انسان کو اچھی جزا ملے۔ یہ سب اعمال نیکی کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اگر یہ نیکی کے مفہوم میں داخل ہیں تو یہ خیر کے دائرہ کار میں موجود ہیں۔ ہر ایسا عمل جو آدمی کو نفسانی خواہش پر عمل کرنے اور شیطان کے رضامندی اور وسوسے پر مبنی ہو تو وہ شر ہے۔ اور اس طرح کے ہر عمل پر دنیا و آخرت میں انسان عقوبت کا مستحق ہوتا ہے۔ ۱۷ وہ بدی میں شامل ہے اگر وہ بدی ہے تو پھر وہ شر کے دائرہ میں شامل ہے۔

امام غزالی کے نزدیک: مضر اور شر میں کوئی فرق نہیں مگر دوسرے علماء ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق تو موجود ہے۔ ممکن ہے بعض اوقات میں ایسا کام کروں جو مضر تو ہو لیکن شر نہ ہو کیوں کہ اس میں میری نیت خیر کو حاصل کرنے کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود حق

و ثواب کی راہ مجھ پر مخفی رہی لیکن امام غزالی اس بات پر متفق ہیں کہ جو عمل مضر ہے وہ یقیناً ساتھ ہی شر بھی ہے کیونکہ امام صاحب کے ہاں یہ قاعدہ ہے کہ اعمال کے خیر و شر کا معیار ہی یہی ہے کہ وہ واقع میں نفع بخش اور مفید یا نقصان دہ اور مضر رساں ہیں۔ امام غزالی احیاء العلوم میں کہتے ہیں کہ:

"جھوٹ کی ذات میں کوئی قباحت نہیں اگر قباحت ہے تو اس وجہ سے کہ اس سے مخاطب یا کسی اور شخص کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔" ۱۸

خیر و شر کی وضاحت کرتے ہوئے مزید بیان کرتے ہیں کہ کوئی چیز یا تو اپنی ذات کی کسی صفت کی وجہ سے حرام ہوتی ہے یا اس لیے کہ اس سے دوسرے کو نقصان ہوتا ہے۔ امام صاحب کا کہنا ہے کہ اگر گردش و انقلاب میں نقصان کی صفت ہوگی تو وہ خدائی کے قابل نہ ہوگا اور اگر انقلابات زمانہ ترقی و صفات خیر کے باعث ہوں گے تو اس کی مثالی ایسی ہو جائے گی جیسے کوئی چیز اول ناقص تھی بعد ازیں کامل ہو گئی۔ یہ صفت بھی مخلوق کے لیے ہوتی ہے خالق کے لئے نہیں۔

امام غزالی کے ہاں خیر و شر کا معیار

باوجود یہ کہ امام غزالی عمل کے حسن و قبح کا سارا معاملہ شرع کے حوالے کرتے ہیں اور اس میں عقل کی مداخلت کو ہرگز برداشت نہیں کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات جب وہ خود کسی عمل کے خیر و شر ہونے کا فیصلہ کرنے نکلتے ہیں تو عقل اور شرع دونوں کی کسوٹی ہاتھ میں لیے نظر آتے ہیں اور جب تک کسی عمل کو ان دونوں کی کسوٹی پر کھ نہیں لیتے اس کے خیر و شر کے قائل نہیں ہوتے۔ میزان العمل میں سخاوت کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ بقاضائے عقل و شرع کسی چیز کو مرضی اور خوشی سے صرف کرنے یا نہ کرنے کا نام سخاوت ہے۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ کہتے ہیں کہ اعضاء و جوارح کی نیکی اور عفت کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ ان کو صرف ایسے کاموں میں صرف کیا جائے جن کو عقل و شرع دونوں نے روار کھا ہو۔ ۱۹

احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ عقل اور شرع دونوں کے متحدہ تقاضے کے تحت شہوت اور غصے کے ضبط کا نام قوت عدل ہے "عمل صالح کی تعریف میں کہتے ہیں۔ عمل صالح وہی ہے جس کو عقل اور شرع دونوں کے ترازوں میں اچھی طرح تول لیا گیا ہو۔ مختصر آئیہ کہ امام غزالی کے نزدیک خیر وہی ہے جو ہر زمانے میں انسان کے لیے خیر کا موجب بنے چاہے اس کا تعلق اس دنیا سے ہو یا آخرت سے۔ دنیا میں بھی انسان کے لیے خیر خواہی کا باعث ہو اور آخرت کے دن بھی۔ مزید برآں امام صاحب کا کہنا ہے کہ اگر انسان کبھی یہ نہ جان پائے کہ یہ کام باعث خیر ہے یا شر تو اسے شرع کا سہارا لینا ہوگا کیونکہ بعض دفعہ عقل بھی انسان کو دھوکہ دے جاتی ہے۔ ہر وہ کام جس میں خیر کار فرماں ہوتا ہے اس کے اندر حقیقت میں انسان کا فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے یا تو وہ مادی دنیا سے فائدہ کی خاطر ایسا کرتا ہے یا رب کی خوشنودی کے لیے اور آخرت میں فلاح کے حصول ہے۔ امام صاحب نے معیار خیر و شر میں شرع پر زور دیا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں انسان کو شرع و عقل دونوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرفیت کا درجہ اس کے علم و عقل کی بنا پر دیا ہے اور انسان اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہوگا جب عقل کو صحیح استعمال کرے گا۔ شرع میں

ایسی کوئی بات نہیں ہے جسے عقل نے نہ مانا ہو میرے ذاتی خیال میں امام صاحب نے معیار کے لیے شرع پر اسی لیے زور دیا ہے کیونکہ شرع و عقل کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔^{۲۰}

ابن رشد کا نظریہ خیر و شر

ابن رشد کے بارے میں حاسدین نے بہت سازشیں کیں ہیں اور اسے لامذہبوں بلکہ تمام موجودات مذاہب کے عقیدوں سے نفرت کرنے والوں کا قائم مقام کہا ہے۔

مذہب چونکہ اس بات کا سب سے بڑا بیان کرنے والا ہے کہ ایک خاص زمانہ میں نوع انسانی کا ضمیر کیا ہوا کرتا ہے اس لیے کسی ایک صدی کے نظام مذہبی کو خوبی سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مذہبی زندگی بسر کی جائے جس سے اتنی گہری واقفیت حاصل ہو سکے گی کہ کسی صاحب تحقیق کی سوچ سے بھی جس کا حاصل کرنا ممکن نہیں۔

ابن رشد نے اصول ہائے اخلاق پر متکلمین سے جو بحث کی ہے وہ ہماری توجہ اپنی طرف معطوف کرنے کا حق رکھتی ہے۔ ابن رشد نے خیر و شر سے متعلق خود بحث کا آغاز نہیں کیا بلکہ اس نے متکلمین کی باتوں کا جواب دیا ہے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ خیر وہی ہے جو خدا چاہتا ہے اور خدا جو کچھ چاہتا ہے وہ کسی ایسے اندرونی سبب کے بناء پر نہیں چاہتا جو اس کے ارادہ سے زمانہ مقدم ہو۔ بلکہ بلا مثال صرف اس لیے کہ اس کی مرضی یہی ہے ہم نے دیکھا ہے کہ متکلمین خدا کے بارے میں متضاد باتوں کے پیدا کرنے کی قوت منسوب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس کے اقتدار میں ہے کہ اپنی مرضی سے جو بالکل آزاد اور پابندی غیر سے پاک ہے عالم کا انتظام جس طرح چاہے بدل دے۔

ابن رشد نے متکلمین کے ان عقائد کی ہمیشہ سے مخالفت کی ہے۔ اس موقع پر وہ یہ کہتا ہے کہ یہ ایک مسئلہ ہے جو حق و ناحق کے تمام تصورات کو الٹ دیتا ہے اور خود اس مذہب کی بنیاد کھوکھلی کر دیتا ہے جسے مستحکم کرنے کا یہ دعویٰ کرتے ہیں۔ انسان نہ تو بالکل مختار ہے اور نہ بالکل مجبور بلکہ انسان کو اختیار حاصل ہے کہ اگر خیر کی طرف جانا چاہے تو خیر کی طرف اپنے قدم بڑھائے اور چاہے تو شر کی طرف۔ انسان کا نفس آزاد اور غیر مقید ہے۔ یعنی اگر انسان کا نفس چاہے تو وہ خیر کو اپنا کر شر کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ تاہم بعض اوقات ایسے خارجی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان کو ان میں خیر و شر کو اپنانے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ابن رشد کا کہنا ہے کہ ہم جو افعال کرتے ہیں ان کی علت فاعلی خود ہمارے اندر موجود ہے لیکن جو علت و سبب و قافو قفا پیدا ہو جائے ہیں وہ بیرونی ہیں جو شے ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے وہ ہماری قدرت میں نہیں ہے اور صرف قوانین یعنی تدابیر الہی سے ظہور میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں انسان کو کبھی تقدیر کا پابند اور کبھی افعال کا مختار بیان کیا ہے۔ جو مسائل جبر یہ و قدریہ کے بین بین ہیں اپنے رسالہ میں بیان کیے ہیں۔^{۲۱}

ابن رشد کا کہنا ہے کہ جس طرح مادہ و متضاد صورتیں قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی طرح نفس بھی دو متضاد افعال میں سے اپنے لیے ایک انتخاب کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ جس طرح مادہ دو متضاد صورتیں قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی طرح نفس بھی دو متضاد افعال میں سے

اپنے لیے ایک انتخاب کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ انسان اگر خیر و شر کو اپناتا ہے تو وہ اس کے نفس پر انحصار ہے کہ وہ ان دونوں میں کس کو اپناتا ہے۔ کیونکہ انسان وہی کرتا ہے جس کی طرف اس کا نفس اسے مائل کرتا ہے بہت سے مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان نفس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور اسے نفس کی ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا ہے۔^{۲۲}

ابن رشد مزید کہتے ہیں کہ انسان کو انتخاب کا جو اختیار حاصل ہے اس اختیار کو نہ مبنی بر خبط کہہ سکتے ہیں اور مبنی نہ بر اتفاق۔ اگر انسان اپنے افعال کے لیے پرواہ کرتا ہے مگر پرواہ کے باوجود وہ اس قابل نہیں کہ وہ کر سکے جو کہ خیر ہے تو ابن رشد ایسی پرواہ کے لیے کہتے ہیں کہ اس پروائی کی کوئی حالت نہیں اور انسان یہ جو پرواہ کرتا ہے یہ بھی صرف انفعالی دنیا تک محدود ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے پاس دور سالے ایسے موجود ہیں جن میں ابن رشد نے مذہبی خیالات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابن رشد کا کہنا ہے کہ کائنات کی پیدائش خدا سے فیضان وجود کے طور پر ہوئی ہے۔ چونکہ وہ خود خیر وجود محض تھا اس لیے وہ مجبور تھا کہ عالم کو وجود میں لائے۔ خدا کو فقط کلیات کا علم ہے اور وہ جزئیات کے علم سے قطعی بے بہرہ ہے۔ جزئیات چونکہ حادث ہیں لہذا جزئیات کے علم سے خود اس کا بھی حادث ہونا قرار پائے گی۔ محالات پر اسے کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔ اس سے صرف خیر کا صدور ہو سکتا ہے۔ شر و فساد اس کے افعال نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا ہی خیر کے مقصد کے لیے کیا ہے انسانوں سے زبردستی کیوں شر کا کام کروائے گا۔ تو وہ متکلمین جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یہ بالکل بھی درست نہیں کیونکہ اگر انسان مجبور ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو آزاد پیدا کیا ہے تو مجبوری کے ساتھ آزادی کا تصور کوئی میل میلاپ نہیں رکھتا۔ انسان اگر خیر و شر میں سے جس کو بھی اپناتا ہے اپنے ارادہ اور اختیار کے تحت اپناتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو پہلے شریعت کے ذریعے یہ بتا دیا کہ فلاں راستہ خیر کا ہے اور فلاں شر کا اگر خیر کی طرف آؤ گے تو جنت مقدر ہے اور شر کی طرف تو جہنم ہی نصیب ہوگی۔ لہذا اپنے افعال کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ کو ٹھہرانا بالکل غلط ہے۔^{۲۳}

اقبال کا نظریہ خیر و شر

علامہ اقبال کے یہاں ابلیس کا تصور ان کے فلسفہ خودی کا لازمی جزو ہے وہ خودی کی تکمیل کے لئے شر کو ناگزیر تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے عام مذہبی تصورات میں شیطان کو راندہ درگاہ قرار دیا جاتا ہے لیکن علامہ اقبال اسے انسانی زندگی کا زبردست محرک سمجھتے ہیں۔ ابلیس جو کہ شر کا نمائندہ ہے خودی کو ضعیف کر دیتا ہے اور خودی کو اپنی طاقت اور بقاء کے لئے اس سے لڑنا پڑتا ہے۔ جب دو خودیاں باہم ٹکراتی ہیں تو طاقتور خودی غالب آ جاتی ہے۔ اقبال کے فلسفہ خودی کی جان نظریہ عشق ہے۔ عشق کی ماہیت آرزو، جستجو اور اضطراب ہے، اگر زندگی میں شیطانی قوتیں مواقع پیدا نہ کریں تو وہ سرگوشی بھی ختم ہو جائے گی جس کی بدولت خودی میں بیداری اور استواری پیدا ہوئی ہے۔ شیطان کائنات میں بھی کار فرما ہے اور ہر شعبہ حیات میں بھی اور انسان کے جسم میں بھی ہے۔ اس تصور میں بھی اور تحت الشعور میں بھی وہ حرکت اور تخلیق کا مصدر ہے۔ علامہ اقبال ابلیس کو نمائندہ شر تصور نہیں کرتے بلکہ اسے خیر ہی کا ایک حصہ تصور کرتے ہیں کیونکہ ابلیس خودی کی ترقی اور تقویت کا وسیلہ ہے۔^{۲۴}

ارتقاء کی تمام منازل طے کرنے کا عمل دراصل شر اور رکاوٹوں سے گزرنے کا عمل ہے۔ اقبال کے یہاں جو تصور ملتا ہے اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ: زندگی خیر ہے اور عدم زندگی شر۔ سلیم احمد کے الفاظ میں اقبال کا شیطان قوت، حسن اور عمل کا نمائندہ ہے۔^{۲۵} علامہ اقبال ابلیس کو دو تین چیزوں کا نمائندہ سمجھتے ہیں اور یہی چیزیں خودی کی ترقی کے لئے ضروری ہے مثلاً

- ۱۔ مزاحمت: جو ابلیس کا ایک زبردست حربہ ہے۔ یہ مزاحمت ترقی کے لیے ضروری ہے پھر ابلیس
- ۲۔ انکار: ابلیس انکار کا نمائندہ ہے۔ اس کا عمل رکاوٹ سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ابلیس کی فطرت
- ۳۔ خود گئی / خود پسندی / خود پرستی

ابلیس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس خود پرستی کی بنا پر وہ ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھتا ہے عام لوگ اسے شر جبکہ علامہ اقبال اسے خیر کا محرک تصور کرتے ہیں کیوں کہ یہ زندگی کو رواں دواں رکھتی ہے۔^{۲۶} اقبال کی خودی کی نمود خیر و شر کی خصوصیت سے ہوتی ہے وہ زندگی کو پیکار تصور کرتے ہیں اور اس پیکار کی بنیاد شر اور خیر کی ثنویت پر ہے اس پیکار کے بغیر زندگی سکون آشنا ہو کر رہ جائے گی اور سکون آشنا زندگی اقبال کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ شیطان، عمل حرکت، اضطراب اور کوشش کا داعی ہے ظاہر ہے خودی کے لئے یہ تمام اعمال باعث برکت ہیں اس لئے خودی اور شیطانی قوتیں لازم و ملزوم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان معنوں میں کہ خودی کی عجب حیات ابلیس کا شر ہے۔

تاج محمد خیال کا کہنا ہے کہ جدید نفسیات کے لئے بھی خیر و شر اور نیک و بد دونوں بحیثیت موضوع مطالعہ یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اقبال کی نگاہ میں بدی یا شر انسانی فطرت کا ایک خیر ہے جو اسے حرکت و عمل پر اکساتی ہے۔ اور اس لیے اقبال نے شیطان کو ایسی عظمت و شوکت بخش دی ہے کہ وہ تخلیق انسان کے ڈرامے کا بد نصیب ہیر و نظر آتا ہے۔ خودی حرکت و عمل سے مستحکم ہوتی ہے اور شیطان حرکت کا سرچشمہ ہے۔^{۲۷}

وہ ذات باری سے کہتا ہے کہ سب ہنگامہ حیات اور زندگی کی تمام گہما گہمی اور رونق اس کی وجہ سے ہے۔ وہ نہ ہو تا تو کائنات میں جنبش نظر نہ آتی اور نہ زندگی میں سوز ساز پیدا ہوتا۔ ابن العربی نے ایک نہایت معنی خیز بات کی ہے کہ جنت کے پھل دوزخ کی آگ سے پکتے ہیں۔^{۲۸} گویا خیر کے لیے شر کا وجود لازمی ہے۔ یہاں اقبال ابن عربی سے متفق ہیں۔ اقبال کبھی کبھی شیطان کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ مرد کامل کی دوسری صورت دکھائی دینے لگتا ہے۔ جبرائیل ابلیس سے عالم رنگ و بو کی حالت دریافت کرتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے۔

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو۔^{۲۹}

جبرائیل ابلیس کو وہ گلیاں یاد دلاتے ہیں جن میں دونوں کا وقت ایک ساتھ گزرا تو پھر اس کے دل میں خواہش پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو

کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو۔^{۳۰}

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر ایلینس حضرت آدمؑ حضرت حواؑ کو جنت سے نہ نکلواتا تو آج یہ تگ و دو کہاں سے نصیب ہوتی۔ اب آدمؑ اپنی مساعی سے جو جنت بنائیں گے وہ اس کے خون و جگر کی پیداوار ہوگی۔ وہ اس کی اپنی کمائی ہوگی۔

جنت تیری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

خلاصہ

جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے، فکر انسان کے سامنے "خیر و شر" کا نظریہ ہمیشہ سے حل طلب رہا ہے۔ ہر شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں خیر و شر، نیکی و بدی اور ثواب و خطا جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ وہ کبھی تو اپنے اعمال و افعال کو اخلاقی کی کسوٹی پر رکھتا ہے اور کبھی دوسروں کے کردار کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان پر اچھائی اور برائی کا حکم لگاتا ہے۔ روزمرہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر دو افراد بھی باہم لڑنا شروع کرتے ہیں تو ہر فریق یہی چاہتا ہے کہ اپنے دلائل کے ذریعے اپنے آپ کو سچا اور دوسرے شخص کو جھوٹا ثابت کرے۔ یہی جذبہ قوموں کی زندگیوں میں بھی کارفرما ہے۔ جب اختلاف کی نوعیت حد سے بڑھ جائے تو مختلف اصول، قواعد و ضوابط سے مدد لی جاتی ہے، جو حق و باطل میں تمیز کر سکیں اور خیر و شر کا حکم نافذ کر سکیں۔ ایک طرف مغربی فلسفہ ہیں کہ جنہوں نے خیر و شر سے آگاہی کا ذریعہ عقل اور معاشرہ کو گردانا ہے مگر جہاں تک مسلم فلسفہ کی بات ہے تو ان کے نزدیک خیر وہ ہے جو ہر زمانے یعنی حال و مستقبل میں انسان کے لئے خیر کا باعث بنے اور شر وہ ہے جو ہر زمانے میں انسان کے لئے اذیت کا باعث بنے۔ مسلم فلاسفر کے نزدیک عقل بعض اوقات انسان کو دھوکہ بھی دے سکتی ہے مگر شرع انسان کو کبھی بھی دھوکہ نہیں دیتی اور نہ کوئی ایسی بات کہتی ہے جو عقل ماننے سے انکار کرے۔ اس لیے مسلم فلاسفر عقل کے ساتھ ساتھ شریعت اسلامی کو بھی خیر و شر سے آگاہی کا اہم ذریعہ گردانتے ہیں۔ عقل، جذبہ اور شہوت میں توازن پیدا ہو جائے تو زندگی میں سعادت اور نیکی پیدا ہو سکتی ہے۔ کوئی شخص جان بوجھ کر غلط عمل نہیں کر سکتا ہر غلط کار جو کچھ کرتا ہے اس کو اس وقت صحیح سمجھ کر ہی کرتا ہے۔ اگر وہ اس کو اچھا اور صحیح نہ سمجھے تو اسے کبھی نہ کرے۔ کسی فعل سے لذت اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ خیر ہوتا ہے۔ لذت اخلاقی فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے یہ بذات خود اخلاقی قدروں کی بنیاد یا معیار نہیں بن سکتی۔ یعنی اگر انسان کو اپنے اعمال سے مسرت و لذت نہ ملے تو وہ شر ہو گئے۔ جس کام کا کرنا ضروری ہو یا جس کا کرنا زیبا و لائق ستائش ہو وہ خیر اور جس کام سے مجتنب رہنا ضروری ہو یا جس کا ارتکاب نازیبا اور ناشائستہ ہو وہ شر ہے۔ خیر تمام یعنی خیر کامل وہی ہے جس میں یہ تینوں صفات موجود ہوں یعنی حال بھی خوش آئے، مستقبل میں بھی سازگار ہو اور ہر زمانے میں سودمند رہے کوئی عمل فی نفسہ اچھا یا برا نہیں ہے بلکہ اچھا وہ ہے جسے شرع نے اچھا کہا ہو۔ برا وہ ہے جسے شرع نے برا کہا ہو۔ کوئی چیز یا تو اپنی ذات کی کسی صفت کی وجہ سے حرام ہوتی ہے یا اس لیے کہ اس سے دوسرے کو نقصان ہوتا ہے۔ انسان اگر خیر و شر کو اپناتا ہے تو وہ اس کے نفس پر انحصار ہے کہ وہ ان دونوں میں کس کو اپناتا ہے۔ کیونکہ انسان وہی کرتا ہے جس کی طرف اس کا نفس اسے مائل

کرتا ہے بہت سے مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان نفس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور اسے نفس کی ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا ہے۔ انسان اگر خیر و شر میں سے جس کو بھی اپناتا ہے اپنے ارادہ اور اختیار کے تحت اپناتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو پہلے شریعت کے ذریعے یہ بتا دیا کہ فلاں راستہ خیر کا ہے اور فلاں شر کا اگر خیر کی طرف آؤ گے تو جنت مقدر ہے اور شر کی طرف تو جہنم ہی نصیب ہوگی۔

حواشی و حوالہ جات

- ^۱ خالد الماس، خیر و شر، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نظریات، (غیر مطبوعہ ایم فل مقالہ، انٹر اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء) ص ۳۵۔
- ^۲ عبد الحکیم خلیفہ، داستان دانش، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۸۱ء، ص ۱۵۳۔
- ^۳ ندوی، مولانا حنیف، اساسیات اسلام، لاہور، اشاعت اول، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۶۔
- ^۴ خالد الماس، خیر و شر، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نظریات، (غیر مطبوعہ ایم فل مقالہ، انٹر اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء) ص ۵۶۔
- ^۵ ڈاکٹر انعام الحق، نظریہ خیر فلسفہ اخلاق، اور قرآن کی روشنی میں، لاہور، سرسید ریسرچ اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۹۸۔
- ^۶ ڈاکٹر وحید عشرت، خیر و شر مجموعہ مقالات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز سن اشاعت ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۹۔
- ^۷ ڈاکٹر وحید عشرت، خیر و شر مجموعہ مقالات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز سن اشاعت ۲۰۰۷ء، ص ۷۲-۷۱۔
- ^۸ خالد الماس، خیر و شر، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نظریات، (غیر مطبوعہ ایم فل مقالہ، انٹر اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء) ص ۸۹۔
- ^۹ ندوی، مولانا حنیف، اساسیات اسلام، لاہور، اشاعت اول، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۳ء، ص ۲۵۹۔
- ^{۱۰} خالد الماس، خیر و شر، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نظریات، (غیر مطبوعہ ایم فل مقالہ، انٹر اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء) ص ۱۰۹۔
- ^{۱۱} ڈاکٹر انعام الحق، نظریہ خیر، لاہور، سرسید ریسرچ اکیڈمی، سن اشاعت ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۱۔
- ^{۱۲} ڈاکٹر انعام الحق، نظریہ خیر، لاہور، سرسید ریسرچ اکیڈمی، سن اشاعت ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۳۔
- ^{۱۳} نور الحسن خان، غزالی کا تصور اخلاق، لاہور، المکتبۃ العلمیۃ، ۱۹۸۰ء، ص ۲۱۵۔
- ^{۱۴} امام ابو حامد محمد الغزالی، نسۃ کیمیائے سعادت (مترجم عبد المجید یزدانی)، اردو بازار لاہور، ناشران قرآن لمیٹڈ۔
- ^{۱۵} نور الحسن خان، غزالی کا تصور اخلاق، لاہور، المکتبۃ العلمیۃ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۴۵۔
- ^{۱۶} نور الحسن خان، غزالی کا تصور اخلاق، لاہور، المکتبۃ العلمیۃ، ۱۹۸۰ء، ص ۲۷۱۔
- ^{۱۷} شاہ ولی اللہ دہلوی، حجتہ اللہ البالغۃ، حصہ اول، مترجم مولانا عبد الرحیم مرحوم، لاہور، قومی کتب خانہ، ص ۳۴۲۔
- ^{۱۸} امام ابو حامد محمد الغزالی، احیاء العلوم، جلد سوئم، اردو بازار لاہور، پروگریسو بکس، ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۹۔
- ^{۱۹} امام غزالی، میزان العمل، لاہور، حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، ۱۹۷۹ء، ص ۸۱۔
- ^{۲۰} امام غزالی، میزان العمل، لاہور، حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، ۱۹۷۹ء، ص ۸۳۔
- ^{۲۱} ڈاکٹر وحید عشرت، خیر و شر مجموعہ مقالات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز سن اشاعت ۲۰۰۷ء، ص ۴۵۹۔
- ^{۲۲} ڈاکٹر وحید عشرت، خیر و شر مجموعہ مقالات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز سن اشاعت ۲۰۰۷ء، ص ۴۵۹۔
- ^{۲۳} ابن رشد، الربط بین المذہب والفلسفہ، کشف الادلۃ، کویت، تاج العروس من جواهر القاموس، ۱۹۹۷ء، ص ۱۷۹۔
- ^{۲۴} ڈاکٹر وحید عشرت، خیر و شر مجموعہ مقالات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز سن اشاعت ۲۰۰۷ء، ص ۵۸۶۔
- ^{۲۵} ڈاکٹر وحید عشرت، خیر و شر مجموعہ مقالات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز سن اشاعت ۲۰۰۷ء، ص ۵۸۶۔

- ^{۲۶} علامہ اقبال، بال جبریل، عنوان (جبریل و ابلیس)، لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۴۔
- ^{۲۷} علامہ اقبال، بال جبریل (عنوان) جبریل و ابلیس، لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۶۔
- ^{۲۸} علامہ اقبال، بال جبریل (عنوان) جبریل و ابلیس، لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۶۔
- ^{۲۹} علامہ اقبال، بال جبریل (عنوان) جبریل و ابلیس، لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۶۔
- ^{۳۰} علامہ اقبال، بال جبریل (عنوان) جبریل و ابلیس، لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۶۔